

اسلام میں سزائے ارتداد

از عبدالمجید صدیقی

(آخری قسط)

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کے واقعات | امر کے گورنر حضرت عمرؓ بن العاص نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ایک شخص نے پہلے اسلام قبول کیا تھا بعد ازاں وہ مرتد ہو گیا اس کے بعد پھر حلقہ بگوش اسلام ہوا اور وہ بارہ اسلام سے منحرف ہو گیا۔ اس تذبذب کے عالم میں متعدد بار اسلام کو قبول اور رد کرنے کے بعد اب وہ آخری بار اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ خلیفہ راشد جناب عمر فاروقؓ نے جواب دیا کہ ہمیں اُس کا اسلام قبول کرتے جانا چاہیے جب تک اللہ اس کو قبول کرتا ہے۔ لہذا اب اُس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے اگر وہ اس کی پیروی سے انکار کر دے تو اس کی گردن قلم کر دیں۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام میں جرم ارتداد کا بار بار ارتکاب گوارا ہے جیسا کہ ناخصل مصنف کا خیال ہے بلکہ دوہین بار مرتد ہونے پر اس کا اسلام اگر قبول کر لیا گیا تو ایسا قرآن پاک کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کفر اختیار کیا
پھر ایمان لائے پھر کفر اختیار کیا اور کفر ہی میں
بڑھتے چلے گئے اللہ انہیں نہیں بخشنے گا اور نہ
راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا
ثُمَّ كَفَرُوا أَتُرِيدُونَ كُفْرًا وَلَكِنَّ
اللَّهَ لِيُغْفِرَ لَهُمْ وَلَا يَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا

(نساء: ۱۳۷)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابن کثیر نے بروایت ابن ابی حاتم حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے:

یستتاب المرء ثلاثا ثم تلا هذه الآية مرتد سے تین بار تو یہ طلب کی جائے گی بعد ازاں آپ نے بطور دلیل یہ آیت تلاوت کی۔ پس اس واقعہ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ ارتداد کے بار بار ارتکاب کا جواز نہیں بلکہ تو یہ

اثابت کا دو تین بار موقع دینا ہے۔

عہد فاروقی کا دوسرا واقعہ جو فتح تستر کے بعد پیش آیا فاضل مصنف نے اسے اپنی کتاب میں بحوالہ شرح معانی الآثار الامام الطحاوی نقل کیا ہے۔ مگر چونکہ اس کے مطابق حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک مسلمان کو ارتداد کا مرتکب ہونے کی بناء پر تو بہ کی مہلت دینے بغیر قتل کر دیا تھا اور مصنف کو اس واقعہ سے اپنے موقف کی تائید میں کوئی چیز نہیں ملی۔ لہذا اسے نقل کرنے کے بعد بلا تبصرہ ہی چھوڑ دیا۔ البتہ امام طحاوی کی اس کتاب سے ایک دوسرا واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھا جو فتح تستر ہی کے دوران پیش آیا تھا اور جس کی تفصیلات یہ ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری کے سفر کی حیثیت سے جب خلیفہ ثانی کے پاس آئے تو آپ نے حضرت انس سے دریافت کیا کہ حجیبہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟ نیز بکر بن وائل کی قوم کا کیا معاملہ ہے؟ تو حضرت انس آپ کے علم میں لائے کہ ان لوگوں کو مرتد ہونے کی بناء پر مسلمانوں نے قتل کر دیا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر آپ لوگ انہیں زندہ گرفتار کر لیتے تو یہ میرے نزدیک قیمتی اشیاء کے حصول سے بھی زیادہ خوش کون بات ہوتی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی اے امیر المؤمنین اگر انہیں زندہ گرفتار کر لیا جاتا تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاسکتا تھا۔ سو اس کے کہ انہیں قتل کر دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر تم انہیں زندہ پکڑ لیتے تو میں ان کے سامنے (داخل ہونے کے لیے) وہی دروازہ پیش کرتا جس سے وہ نکل گئے تھے (اسلام) پھر اگر وہ اسلام قبول کر لیتے تو خیر بصورت دیگر میں انہیں جیل میں ڈال دیتا۔ حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے شیخ صاحب۔ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ارتداد کی سزا قتل نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ نے قتل کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا لیکن ہم شیخ صاحب کے اس استدلال کو بوجہ غلط سمجھتے ہیں۔

- ۱- جب حضرت انسؓ نے یہ کہا تھا کہ اے امیر المؤمنین زندہ گرفتار کر لینے کی صورت میں بھی انہیں نہ قتل ہی تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ کو انہیں فوراً ٹوکنا چاہیے تھا کہ یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل کس نے مقرر کی ہے؟ لیکن معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایسی گرفت نہیں کی۔
- ۲- اسلام میں قتل ناسحق کوئی معمولی جرم نہیں بلکہ کبیرہ گناہ اور واجب القصاص فعل ہے اگر فی الواقع ارتداد کی سزا قتل نہ ہوتی تو حضرت عمرؓ محض یہ فرما کر نہ رہ جاتے کہ ”میں انہیں جیل میں ڈال دیتا“ بلکہ ان قبائل کے قتل کے مرتکب حضرت ابو موسیٰ اشعری کو قانون قصاص کے تحت قتل کر ڈالتے یا ان کی طرف سے

خون بہا ادا کرتے لیکن تاریخ در روایات کا ذخیرہ شاید ہے کہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی باریک بین اور شریعت کے بارے میں محتاط شخصیت نے ان قبائل کے قتل پر ایسے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

۲۔ سزائے ارتداد کے باب میں جیسا کہ معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ کا مسلک یہ تھا کہ مرتد کو توبہ کی مہلت ملنی چاہیے پھر اگر وہ تائب نہ ہو تو اسے قتل کر دیا جائے۔ چونکہ ان قبائل کو توبہ کی مہلت نہ دی گئی تھی، اسی لیے حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا کہ میں ان کو جیل میں ڈال دیتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک جیل ہی ارتداد کی آخری سزا تھی بلکہ جیل میں ڈالنے کا مقصد توبہ و ندامت کے لیے مہلت دینا تھا اور یہی مطلب ان کے عہد کے دوسرے واقعات ارتداد سے مطابقت رکھتا ہے۔

ارتداد کے سلسلہ میں عہد فاروقی کا تیسرا واقعہ قتل عبداللہ بن النواصر کا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ مسجد بنی حنیفہ میں کچھ لوگ مسیلہ کی نبوت کا اعلان کر رہے تھے حضرت عبداللہ بن مسعود جو کوفہ کے قاضی القضاة تھے نے انہیں بلا بھیجا۔ سب نے اگر توبہ کر لی اور انہیں چھوڑ دیا گیا مگر عبداللہ بن النواصر کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ بعد ازاں عبداللہ بن مسعود نے وضاحت کی کہ ابن النواصر دو آدمیوں میں سے ایک تھا جو مسیلہ کے سفیر کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے۔ آپ نے جب ان سے استفسار کیا کہ آیا وہ آپ کی نبوت کی گواہی دیتے ہیں تو انہوں نے جواباً کہا کیا آپ یہ گواہی دیتے ہیں کہ مسیلہ اللہ کا پیغمبر (معاذ اللہ) ہے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر سفیروں کو قتل کرنے کی اجازت ہوتی تو تم دونوں کو قتل کر دیا جاتا۔ (عبداللہ بن مسعود) کہتے ہیں۔ اس وقت ان کو چھوڑ دیا گیا کہ سفیروں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ مگر اب جبکہ قبول اسلام کے بعد وہ پھر نبوت مسیلہ کا اقرار کر رہا تھا تو اس کو چھوڑا نہیں جاسکتا تھا کہ اس نے ایک عادی مرتد کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد رحمان صاحب کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود کو چاہیے تھا کہ اس کی توبہ بھی قبول کر لیتے جس طرح دوسروں کی توبہ قبول کی تھی اور اسے قتل نہ کرتے لیکن چونکہ انہوں نے اس اصول سے ہٹ کر قتل کرنے کا حکم دے دیا یہ عبداللہ بن مسعود کا ذاتی فعل قرار پایا۔ اسے بطور نظیر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ مزید برآں رحمان صاحب کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آ رہی کہ سفیر کی حیثیت سے جو کلمات کفر ابن النواصر نے کہے تھے ان کی بنیاد پر بعد میں اسے کیوں قتل کر دیا گیا؟ جبکہ اس کی وہ حیثیت بھی نہیں رہی تھی اور ایک دوسرے جرم میں اسے ماخوذ کیا گیا تھا دوسری طرف اس کے غلط رویہ کے باوجود رسول پاک نے اس کی جان بخشی کر دی تھی پس یہ جان بخشی والا اصول ہی عبداللہ بن مسعود کو بھی پیش نظر

نظر رکھنا چاہیے تھا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عبد اللہ بن مسعود نے اس کی توبہ کو قبول کیوں نہیں کیا؛ تو اس کا جواب رحمان صاحب کو وہیں سے مل سکتا تھا جہاں سے انہوں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے نہ معلوم ان کی نظر ادھر کیوں نہیں گئی۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں یہ اثر درج کرنے کے بعد لکھا ہے :-

فہذا عبد اللہ بن مسعود قد قتل
ابن النواحة ولحقه توبته اذ
علم ان هكذا خلقه يظهر التوبة
اذا ظفر به ثور يهود الى ما كان عليه
اذا خلى۔

عبد اللہ بن مسعود نے ابن النواحة کو قتل کر دیا
اور اس کی توبہ قبول نہ کی کیونکہ انہیں معلوم تھا
کہ اس شخص کی یہ عادت ہے کہ جب اس پر
ہاتھ پڑ جاتا ہے تو توبہ کرنے لگتا ہے اور
جب اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تو سابق عقائد

دکتاب السیر باب استتابة المرتد (نظریات کی طرف پلٹ جاتا ہے۔)

رہ گئی یہ بات کہ سفیر کی حیثیت سے ابن النواحة نے جو کلمات کہے تھے ان کی بنیاد پر اسے قتل کر دینا ناقابل فہم ہے تو ایسی بے وزن بات کی توقع ہمیں فاضل مصنف سے بالکل نہ تھی۔ موصوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابن النواحة اور اس کا ساتھی بطور سفیر آپ کے پاس آنے سے پیشتر اپنے قبیلوں سمیت مسلمان ہو چکے تھے بعد ازاں جب مسیلہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو یہ اس کے ساتھی بن گئے اس طرح دونوں جرم ارتداد کا ارتکاب کر چکے تھے۔ رسول پاک نے انہیں جو تحفظ دیا وہ ان کے سفیر ہونے کی بناء پر تھا۔ مرتد کے لیے کوئی رعایت آپ کے پیش نظر نہ تھی اگر ہوتی تو آپ ان کو قتل کی وعید نہ سناتے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے یہ واقعہ بیان کر کے جو کچھ ثابت کیا ہے وہ یہ ہے کہ اُس وقت بھی یہ سزائے ارتداد (قتل) کا مستحق تھا مگر اس کی سفارت اسے بچا گئی بعد ازاں یہ موقع نہ موقع ارتداد کا اعلان کرتا رہا مگر گرفتار ہو کر توبہ کر لیتا مگر اب اسے توبہ کا مزید موقع نہیں دیا جاسکتا کہ یہ پہلے ہی ایسے کئی مواقع حاصل کر چکا ہے۔

سزائے ارتداد کی نفی کے بعد ابن النواحة کے قتل کی مذکورہ توجیہات چونکہ کچھ یوں ہی سی تھیں اس لیے فاضل مصنف خود بھی ان سے مطمئن نہیں ہوئے اور آخر میں وہی پرانی نرٹ لگانی ضروری سمجھی کہ مسیلمہ اسلامی حکومت کا باغی تھا اور اس کے پیرو بھی باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے تھے اس لیے ابن النواحة کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن یہ بات کرتے وقت فاضل مصنف کو یاد نہیں رہا کہ ابھی اوپر وہ خود بیان کر آئے ہیں کہ

ابن النواصر کے ساتھیوں کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ حالانکہ اگر یہ لوگ فی الواقع باغی تھے تو ان کو چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

آخر میں گرامی قدر شیخ صاحب نے مصنف عبدالرزاق سے ایک ام ولد کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد مذہب عیسائیت اختیار کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسے اغیار کے ہاتھ فروخت کرنے کا حکم دے دیا اور قتل نہیں کیا اس سے وہ بے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ارتداد کی کوئی متعین سزا (قتل) نہیں تھی اگر ہوتی تو اس ام ولد کو بھی دی جاتی۔ اس کے بارے میں گزارش ہے کہ ہم پیسے عرض کر آئے ہیں کہ اصولی طور پر تو ارتداد کی سزائے قتل پر مسلمانوں کا کامل اتفاق ہے مگر اس باب میں امت کے اہل علم کے مابین بعض فرعی اور جزئی اختلافات بھی موجود ہیں مثلاً یہی کہ مرتد اگر عورت ہو تو اسے قتل نہ کیا جائے بلکہ قید میں رکھ کر توبہ کا موقع دیا جائے۔ لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن قتیل النساء یہی کسی فرمان رسولؐ سے استنباط کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے ام ولد کے بارے میں مذکورہ فیصلہ دے دیا ہوگا۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ اس طرح کے جزئی اختلافات کو دیکھ کر دین کی متفق علیہ تعلیمات پر خط تیسخ تو نہیں کھینچا جاسکتا۔ مقام غور ہے کہ ایک طرف صحیحین کی واضح نصوص، امت مسلمہ کا متواتر عمل اور اہل علم کا چودہ سو سالہ اتفاق رائے ہے اور دوسری طرف تیسرے درجے کے مجموعہ حدیث (مصنف عبدالرزاق) کی ایک محتمل المعنی روایت ہے مگر رحمان صاحب ہیں کہ انہیں ترجیح کے قابل صرف یہ روایت نظر آ رہی ہے اور باقی کسی چیز کا کوئی وزن محسوس نہیں ہو رہا۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ جس مجموعہ حدیث کی یہ روایت ہے اسے فاضل مصنف خود ناقابل اعتبار قرار دے چکے ہیں (مصنف کی کتاب ص ۵۸) لیکن اب چونکہ اس میں ایک روایت ایسی مل گئی ہے جس سے رحمان صاحب کھینچ تان کر کے اپنا مطلب نکال سکتے ہیں اس لیے اب یہ مجموعہ احادیث مستند اور معتبر بن گیا ہے۔ اہل تحقیق تحقیق کا یہ نادر نمونہ یاد رکھیں۔

نجران کے عیسائیوں کی جلاوطنی کا واقعہ بھی فاضل مصنف کی نظر میں سزائے ارتداد کی نفی کر رہا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب ”سیاسی وثیقہ جات“ کی جس تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

حضرت عمرؓ نے اہل نجران کے نام لکھا:

بعد ازیں کہ تم نے اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف کیا اور اس کے بعد مرتد ہو گئے۔ اب بھی تم میں سے جو شخص توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے اس کے ارتداد پر مواخذہ نہ ہوگا۔ اور ہم اس کے ساتھ بہتر سلوک کریں گے۔ تم گذشتہ انعامات کو یاد کرو اور خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ تم میں سے جو شخص مسلمان ہو جائے اس کے لیے

سلامتی کی خوش خبری ہے اور جو شخص اسلام کے بجائے نصرانیت قبول کر کے اس پر اکتفا کر لے تو ہمیں اُس کی امان سے کوئی سروکار نہیں۔ بخران میں یہ حکم نصابی کے ماہِ صیام کی گیارہویں تاریخ سے نافذ ہوگا۔.....

اس تحریر میں آخر کہاں سے ثابت ہو گیا کہ مرتدین کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے اور ان کے لیے کوئی سزا نہیں فاضل مصنف ہمیں بتائیں کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے ”تم گزشتہ انعامات کو یاد کرو اور خود کو بلاکت میں نہ ڈالو“ نیز یہ کہ جو شخص اسلام کے بجائے نصرانیت قبول کر کے اس پر اکتفا کر لے تو ہمیں اس کی امان سے کوئی سروکار نہیں۔ مزید برآں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت عمرؓ نے تو انہیں جلا وطن ہو جانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ پھر وہ لوگ کس خوف کی بناء پر حدود و مملکت اسلامیہ سے نکل گئے؟ حضرت عمرؓ نے اس تحریر کے ذریعہ مرتدین کو توبہ کے لیے ایک ذقت مقرر تک ہمت دی تھی جس کے اختتام پر انہیں اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ اسی لیے اپنے وطن کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے۔

عہد عثمانی کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے ابتدائی دو واقعات — جن میں سے ایک میں حضرت عثمانؓ نے ارتداد کی سزائے قتل کا ذکر کیا ہے اور دوسرے میں ایک مرتد کو تین بار توبہ کا موقع دینے کے بعد قتل کرنے کا حکم دے دیا — کے بارے میں کہا ہے کہ ان کی پوری تفصیل اور پس منظر ہمارے علم میں نہیں اس لیے ان سے سزائے ارتداد (قتل) کے حق میں استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اور پوری تفصیل سے رحمان صاحب کی مراد یہ ہے کہ ان واقعات میں محاربہ و بغاوت کا ذکر ہونا چاہیے تاکہ موصوف کہہ سکیں کہ یہ ارتداد کی سزا نہیں بلکہ بغاوت کی سزا ہے۔

اور تیسرے واقعہ میں موصوف نے زمیندار کے ایک گنہگار اہل قلم کی ترجمانی و تعبیر کا سہارا لیا ہے جو ہمارے نزدیک اس قابل نہیں کہ اس کا تعاقب کیا جائے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کا تذکرہ کرتے ہوئے رحمان صاحب نے اُس واقعہ پر قدرے تفصیل سے بحث کی ہے جس کے مطابق حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے زنادقہ کے ایک گروہ کو جلا کر ہلاک کر دیا تھا پھر جب حضرت عبداللہ بن عباسؓ تک یہ خیر پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں (حضرت علیؓ کی جگہ) ہوتا تو ان کو جلا کر نہ مارتا کیونکہ عذاب کے اس طریقہ سے رسول پاک نے منع فرمایا ہے۔ لا تعذبوا بعباد اللہ۔۔۔ البتہ انہیں قتل کر ڈالتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”جو اپنا دین بدل ڈالے اسے قتل کر دو“

اس اثر سے اپنا دل پسند مطلب اخذ کرنے کے لیے پہلے تو فاضل مصنف زنادقہ کے بارے میں وارد مختلف اقوال میں سے اس قول کو لیتے ہیں کہ یہ بعد اللہ بن سبا کے پیر و تھے پھر فرماتے ہیں کہ سبائی حضرات کی سرگرمیاں امن عامہ کے منافی تھیں اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ ان کو جو سزا دی گئی وہ محض ارتداد کی نہیں بلکہ امن دشمن سرگرمیوں کی سزا تھی اس تشریح کے بعد صحیح البخاری کی اس روایت میں موصوف کو ایک فنی کمزوری بھی نظر آئی ہے۔ یعنی عکرمہ متہم بالکذب راوی ہیں اور وہ حضرت علیؑ کے خلاف جھوٹی روایات گھڑا کرتے تھے۔ ان ساری باتوں کا مقصد غالباً یہ ہے کہ یا تو اس اثر کا وہ مفہوم مراد لیا جائے جو رحمان صاحب کو پسند ہے یا پھر اس روایت ہی کی کوئی قدر و قیمت قاری کے ذہن میں باقی نہ رہنے دی جائے۔

جامع البخاری کا جو مرتبہ اور مقام ہے اس کے پیش نظر اس طریق تحقیق کو ہم بودا ہی قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ جن لوگوں کو آگ میں جلا کر ہلاک کر دیا گیا تھا ان کی حقیقت کا پتہ اگر ہمیں حدیث ہی کی کسی اور روایت سے چل سکتا ہو تو کتب تاریخ اور مختلف لوگوں کے اقوال کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ سنن ابی داؤد میں واقعہ احراق کی تفصیل یوں ملتی ہے:

حدثنا احمد بن حنبل نا اسمعيل بن
ابراهيم اخبرنا ايوب عن عكرمة ان
علياً احرق الناس ارتداً عن الاسلام
فبلغ ذلك ابن عباس فقال له ان
لا احراقهم بالناس ان رسول الله صلى
الله عليه وسلم قال لا تعذبوا بحداب
الله وكنتم قاتلهم بقول رسول الله
صلى الله عليه وسلم فان رسول الله
صلى الله عليه وسلم قال من بدل
دينه فاقتلوا -

امام ابو داؤد نے فرمایا کہ ہم سے احمد بن محمد
بن حنبل نے حدیث بیان کی اس نے کہا کہ
ہم سے اسمعیل بن ابراہیم نے حدیث بیان کی
اس نے کہا کہ ہمیں ایوب سے عکرمہ نے خبری
کہ حضرت علیؑ نے کچھ لوگوں کو آگ میں ڈال کر جلا
دیا جو اسلام سے پھر گئے تھے۔ جب یہ خبر
حضرت عبداللہ بن عباسؓ تک پہنچی تو انہوں نے کہا
کہ میں تو ان کو آگ میں ہرگز نہ جلاتا کیونکہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”لا
تعذبوا بحداب اللہ“ البتہ رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے تحت ”کہ جو اپنا
دین بدل ڈالے اسے قتل کر دو“ انہیں قتل کر دیتا۔

(باب الحكم في من ارتد)

اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ زنادقہ کا وہ گروہ پیرو جس کا بھی ہو اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو گیا تھا۔ اُن کے ارتداد عن الاسلام کی تفصیل فتح الباری شرح صحیح بخاری کی ایک روایت سے یہ ملتی ہے کہ حضرت علیؑ سے کہا گیا کہ مسجد کے دروازے پر کچھ لوگ آپ کو اپنا رب کہہ کر پکار رہے ہیں۔ آپ نے ان کو بلایا اور فرمایا تم پر افسوس ہے تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا آپ ہمارے رب ہیں ہمارے خالق اور رازق ہیں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا تم پر افسوس ہے میں تو تمہاری طرح خدا کا ایک بندہ ہوں تمہاری طرح کھانا کھاتا ہوں اور پانی پیتا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کروں تو وہ چاہے تو مجھے جزا دے اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے عذاب دے گا لہذا تم اللہ سے ڈرو اور اپنے اس قول سے رجوع کر لو مگر انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اگلے دن بھی آپ کے دریافت کرنے پر انہوں نے ویسی باتیں دہرائیں۔ تیسرے دن حضرت علیؑ نے انہیں بلا کر دھکی دی کہ اگر اب بھی تم نے وہی بات کہی تو میں تمہیں بدترین طریقہ سے قتل کر دوں گا۔ مگر وہ اپنی بات پراٹھے رہے آخر حضرت علیؑ نے ان کے لیے ایک کھائی کھدوائی جس میں آگ جلوائی اور پھر ان سے کہا کہ دیکھو اس قول سے باز آ جاؤ مگر انہوں نے رجوع نہ کیا۔ چنانچہ انہیں گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ اور وہ جل کر مر گئے۔

رہ گئی یہ بات کہ عکرمہ کی طرف کسی نے کذب کی نسبت کی ہے اور وہ حضرت علیؑ کے خلاف جھوٹی روایات وضع کیا کرتے تھے تو اس معاملے میں ہمیں یہ اصول ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی راوی کی ثقاہت و عدم ثقاہت کا فیصلہ اُس کے بارے میں اکثریت کی رائے کو دیکھ کر کیا جاتا ہے چند اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ معاشرت کا فتنہ بڑا قدیم ہے اور اہل علم میں باہم چشمک ہوتی ہی ہے۔ علاوہ انہیں اس وقت کے سیاسی و معاشرتی حالات کے بھی کچھ تقاضے تھے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی حضرت عکرمہ کے بارے میں آئمہ حدیث کی رائے بڑی اچھی ہے۔ اکمال فی اسماء الرجال میں عکرمہ کے تحت لکھا ہے :

ہو احد فقیہاء مکة و تابعیہا سمع ابن	یہ فقہاء مکہ میں سے ایک ہیں اور ان کا شمار
عباس و غیرہ من الصحابة روی	مکہ کے تابعین میں ہوتا ہے انہوں نے
عنه خلق کثیر مات سنة سبع و مائة	ابن عباس اور دیگر صحابہؓ سے حدیث سنی اور
وله ثمانون سنة قيل لسعيد بن	ان سے بڑی تعداد میں لوگوں نے احادیث
جبیر هل احد اعلم منك قال عکرمہ	کی روایت کی سترہ میں اتنی سال کی عمر میں

وفات پائی۔ سعید بن جبیر سے پوچھا گیا کہ آپ
سے زیادہ علم رکھنے والا بھی کوئی ہے؟ تو
انہوں نے کہا عکرمہ۔

نیز امام بخاری نے اپنی کتاب الجامع الصمیم میں — جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے — ان کی مرویات
کو شامل کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے وہ کسی غیر ثقہ راوی کی احادیث کو اپنے مجموعہ میں شامل نہیں کر سکتے تھے
عکرمہ کے بارے میں امام موصوف کی رائے ملاحظہ ہو:

لیس احد من اصحابنا الا وهو
ہمارے اصحاب میں کوئی ایسا نہیں جو عکرمہ
یحتج بحکمۃ -
(کی مرویات) سے حجت نہ پکڑتا ہو۔

خلافت راشدہ کے نظائر پر بحث کرتے ہوئے فاضل مصنف نے تقریباً سارا زور اس بات پر صرف کیا
ہے کہ جن لوگوں کو قتل کیا گیا ہے وہ باغی اور محارب تھے۔ جہاں تک پرسکون ارتداد (PEACEFUL APOSTASY)
اور غیر محارب مرتدین (NON MILITANT APOSTATES) کا تعلق ہے، خلفائے راشدین نے انہیں
کبھی قتل کا مستوجب نہیں سمجھا۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ریاست مذہب کے نام پر قائم ہوئی ہو اُس ریاست میں اُسی
مذہب سے ارتداد کیا (PEACEFUL) بھی قرار دیا جاسکتا ہے؟ مذہب اسلام، اسلامی ریاست کا دستور
آئین ہوتا ہے کیا کسی ملک کے دستور و آئین سے انحراف کی اُس کے شہریوں کو اجازت ہوتی ہے؟ آئین سے
وفاداری کا حلف اٹھانے کے بعد اگر کوئی اس سے غداری کا مرتکب ہو تو اس کو کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔ اسی
طرح ہر مسلمان جو اپنے دستور آئین کا وفادار ہوتا ہے اگر ارتداد کا مرتکب ہو تو اس کو غداری پر محمول کیا جائے
گا۔ اور اس کے اس فعل کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ ہر نظریاتی ریاست اپنے نظریہ کے تحت قتل کے لیے ایسا
کرنا ضروری سمجھتی ہے۔

سزائے ارتداد فقہاء کی نظر میں | اپنی کتاب کے چوتھے باب میں جناب ایس اے رحمان نے حرف آغاز ہی اس بات
سے اٹھایا ہے کہ یہ خیال کہ مرتد کی سزا قتل فقہاء کے نزدیک ایک متفق علیہ مسئلہ ہے صحیح نہیں کیونکہ اس مسئلہ
میں فقہاء کے درمیان بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ اختلاف یہ ہے کہ آیا ہیئتِ حاکمہ کو لازم ہے کہ
مرتد کا جرم ثابت ہونے پر اسے تو بہ کا موقع دے یا ایسا کوئی موقع دے بغیر ہی اسے قتل کر ڈالے۔ عورتوں

کو جرم ارتداد کی سزا (قتل) سے مستثنیٰ کیا جائے گا یا نہیں نیز یہ کہ بار بار ارتداد پر بار بار توبہ قبول کی جائے گی یا نہیں یہ فروعی قسم کے اختلافات چھ سات صفحات پر پھیلا کر موصوف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ سزائے ارتداد پر فقہاء امت متفق نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس باب میں تعلیمات دین کا سرسری مطالعہ رکھنے والا آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ ان اختلافات سے نفسِ مشد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ارتداد سے متعلق ائمہ اربعہ وغیرہم کے مسالک تاریہین کے سامنے آجائیں۔ امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر امام مرتد سے توبہ کا مطالبہ کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے پھر اگر وہ شخص توبہ کرے تو چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔ نیز یہ کہ جو شخص اسلام سے ناواقفیت کی بنا پر مرتد ہوا ہو تو اس کو پہلے سمجھا کر اسلام کی طرف واپس لانے کی کوشش کی جائے۔ مگر جو شخص سوچ سمجھ کر اسلام سے خارج ہوا ہو اسے توبہ کی دعوت دیئے بغیر قتل کر ڈالا جائے۔

(شرح معانی الآثار۔ کتاب السیر بحث استانبہ المرتد)

امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ امام کو لازم ہے کہ مرتد کو تین دن کی مہلت دے اور اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس سے پہلے اسے قتل کر دے کیونکہ ایک مسلمان کا ارتداد بظاہر کسی شبہ ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ لہذا ایک مدت ضرور ہونی چاہیے جس میں اس کے لیے غور و فکر کا موقع ہو اور اس غرض کے لیے ہم تین دن کافی سمجھتے ہیں۔ (بحوالہ ہدایہ باب احکام المرتدین)

امام احمد بن حنبل کا مسلک یہ ہے کہ جو عاقل و بالغ مرد یا عورت اسلام کے بعد کفر اختیار کرے اسے تین دن تک توبہ کی مہلت دی جائے اور اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے۔ یہی رائے حسن بصریؒ، زہریؒ، ابراہیمؒ، نخعیؒ، مکحولؒ، حمادؒ، مالکؒ، لیثؒ، اوزاعیؒ، شافعیؒ اور اسحاق بن راہویہ کی ہے۔

(المغنی ج ۱۰ ص ۷۷)

امام مالکؒ نے اپنا مسلک حدیث رسولؐ من غیر دینہ فا ضربوا عنقه کے تحت یہ بیان کیا ہے کہ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے نکل کر کسی دوسرے طریقہ کا پیرو ہو جائے مگر اپنے کفر کو چھپا کر اسلام کا اظہار کرتا رہے جس طرح کہ زنادقہ اور ان جیسے دوسرے لوگ کرتے ہیں تو اس کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد اسے قتل کر دیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

کیونکہ ایسے لوگوں کی توبہ کا کچھ اعتبار نہیں۔ لیکن جو شخص بر ملا اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے تو اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے اگر وہ توبہ کرے تو فہم المطلوب۔ بصورت دیگر اسے قتل کر دیا جائے۔
(الموطا لامام مالک۔ القضاء فی من ارتد عن الاسلام)

آئمہ اربعہ کے ان مسالک پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نفس مسئلہ پر کسی امام کو کوئی اختلاف نہیں البتہ بعض جزئیات میں مثلاً توبہ کا موقع ہر ایک مرتد کو دیا جائے یا نہ دیا جائے اور اگر دیا جائے تو کتنی بار اور کب تک۔ نیز مرد عورت کو قتل کیا جائے یا قید میں رکھا جائے۔ اختلاف ہے۔ لیکن اس اختلاف کو دیکھ کر سزائے ارتداد ہی کا انکار کر دینا کسی طرح بھی درست نہیں یہ دیانتداری کے بھی منافی ہے اور مسائل اسلامی کی دانستہ غلط تعبیر کی بھی نہایت ناروا اور مذموم کوشش ہے فقہاء کے مذکورہ فروری اختلافات کے بارے میں ہم پہلے بھی عرض کر آئے ہیں کہ ان کی بنیاد کسی نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث رسول کی نص پر ہوتی ہے۔ فقہاء کے سامنے ایک طرف اسلام کا یہ واضح حکم ہے کہ مرتد کو قتل کر دو۔ دوسری طرف وہ اس باب میں رسول پاک اور صحابہ کرام کا یہ عمل دیکھتے ہیں کہ قتل سے پہلے وہ مرتد کو توبہ کی دعوت دیتے ہیں۔ پھر رسول پاک کا یہ فرمان بھی ان کے علم میں آتا ہے کہ عورتوں کو قتل نہ کرو۔ تو ان سارے احکام پر عمل پیرا ہونے کے لیے وہ تطبیق و توفیق کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان کے اقوال و مسالک میں کمال اخلاص کے باوجود کچھ اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ تاہم کسی فقیہ نے اُمت کو پابند نہیں کیا کہ اس کی ہر تعبیر اور اجتہاد کو لازماً صائب ہی سمجھے۔ انہوں نے اپنے اقوال و مسالک کے دلائل بیان کر دیئے ہیں جنہیں معلوم کر کے اگر کوئی شخص مطمئن ہو جائے تو وہ ان کو قبول کر سکتا ہے۔ کہنے کا منشاء یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں فقہاء کے جزئی اختلاف کی بنیاد پر اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

استتابۃ المرتد کے ضمن میں امام شوکانی نے فرمایا:

واختلف القائلون بالاستتابۃ هل	مرتد سے طلب توبہ کے قائلین کا اس میں اختلاف
یکتفی بالمرآة اولاً بدمن ثلاث وهل	ہے کہ آیا ایک مرتبہ ہی توبہ طلب کرنا کافی
الثلاث فی مجلس واحد او وثلاثۃ	ہے یا لازماً تین بار توبہ کی دعوت دینی چاہیے
ایام و قتل ابن بطلال عن امیر المؤمنین	پھر یہ کہ تین بار توبہ ایک ہی مجلس میں طلب
علی رضی اللہ عنہ انه یستتاب	کی جائے یا تین دنوں میں۔ اور ابن بطلال نے

شہرہاء، وعن النخعی یستتاب ابداً
 (بحوالفقہ السنۃ لیسید سابق جلد ۲ -
 صفحہ ۲۵۹)
 حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ
 مرتد سے ایک مہینہ تک توبہ کا مطالبہ کیا جائے
 اور امام نخعی سے ہمیشہ تک طلب توبہ کا قول
 منقول ہے۔

استتابة المرتد سے متعلق مندرجہ بالا عبارت کو ہر شخص پڑھ کر خود سمجھ سکتا ہے کہ اس اختلاف کی نوعیت کیا ہے اور کیا اس میں اتنی جان ہے کہ اس کی بنیاد پر مرتد کی سزائے قتل کو موقوف کر دیا جائے۔ جہاں تک امام نخعی کے اس قول کا تعلق ہے کہ مرتد سے ہمیشہ تک توبہ کا مطالبہ کیا جائے تو معلوم ہونا چاہیے ان کی ایک رائے اور پر بھی گزر چکی ہے جس کے مطابق مرتد کو توبہ کی ہدایت کے لیے تین دن دیئے گئے ہیں۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ امام نخعی کا اول الذکر قول ان کا آخری قول ہے تو بھی کس عقلی اور شرعی دلیل کی رو سے یہ جائز ہے کہ قرآن و سنت کی نصوص اکابر صحابہ کے فتاویٰ، خلافت راشدہ کے نظائر اور امت مسلمہ کے متواتر عمل کے مقابلہ میں اکیلے امام نخعی کے قول کو ترجیح دی جائے۔ رحمان صاحب نے اس موضوع پر خاصی تفصیل سے بحث کی ہے اور مرتد کو سزائے قتل سے بچانے کے لیے اپنی دیگر کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہوتے دیکھ کر موصوف اُس پر توبہ کے دروازہ کو ہمیشہ کے لیے کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس اس کی دلیل ایک تو وہی امام نخعی کا قول ہے کہ مرتد پر طلب توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے دوسرے قرآن پاک کی یہ آیت:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْلَمُونَ
 السُّوءَ بِجَهْلَةٍ تُوْبُوا مِنْ قَرِيبٍ
 فَأُوْبِيكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ
 اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا -

(النساء - ۱۷)
 بے شک اللہ تعالیٰ پر توبہ کی قبولیت کا حق
 انہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے
 کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی
 ہی توبہ کر لیتے ہیں ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت
 سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں
 کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانایا ہے۔

چونکہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین نے "من قریب" کا مطلب "مائل بغض" بھی کیا ہے
 یعنی جان نکلنے سے پہلے پہلے توبہ کر لیں۔ اس لیے فاضل مصنف کہتے ہیں کہ مرتد کو بھی توبہ کی ہدایت موت
 تک ملنی چاہیے۔ لیکن رحمان صاحب مرتد کے لیے جتنے بھی مہربان ہوں اللہ تعالیٰ کو بہر حال فعل ارتداد قطعاً

گورا نہیں۔ قبولِ توبہ کے اس عام حکم میں اللہ تعالیٰ مرتد کو شامل نہیں کرنا چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک دوسری آیت میں واضح طور پر فرمادیا کہ اسلام کو سمجھنے اور قبول کرنے کے بعد جو شخص دانستہ کفر کی طرف پلٹ جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول نہیں کریں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ
 آذُوا دُودًا وَكَفَرُوا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ
 وَأُولَئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ۔
 بلاشبہ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر
 کی روش اختیار کی اور پھر کفر ہی میں بڑھتے
 چلے گئے ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی یہی لوگ
 پکے گمراہ ہیں۔
 (آل عمران : ۹۰)

یہ آیت مرتد کی توبہ کے عدم قبول پر صریحاً دلالت کرتی ہے اور کسی مفسر کا قول اس کے مفہوم کی تعیین و تحدید نہیں کر سکتا۔

بعض متعالموں کا ازالہ (۱۱) فقہائے اقوال و مسائلک پر بحث کرتے ہوئے گرانی قدر مصنف نے آخر میں بعض مغالطے دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بڑے ائمہ و فقہاء نے اپنے پیروؤں کو یہ تلقین کی ہوئی ہے کہ اگر ہمارا کوئی قول یا رائے قرآن و سنت کے مطابق نہ ہو تو اسے ترک کر دیا جائے لہذا سزائے ارتداد کے باب میں چونکہ ان کا موقف صاحب نہیں اور قرآن و سنت کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے اسے نظر انداز کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

فاضل مصنف کا سزائے ارتداد کے بارے میں جو موقف ہے وہ قارئین کرام کے سامنے آچکا ہے یعنی مرتد کو قتل نہیں کرنا چاہیئے اور اسے موت تک ہملت (کھلی چھٹی) ملنی چاہیئے تاکہ وہ رجوع کر سکے۔ مغربی تعلیم کے زیر اثر تشکیل پانے والے اس نام نہاد موقف میں جتنا دزن ہے وہ ہر شخص فریقین کے دلائل کو معلوم کرنے کے بعد خود محسوس کر سکتا ہے اور اس موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے رحمان صاحب نے آیات قرآنی کی جس طرح غلط تعبیر کی ہے اور احادیث رسول اور خلفائے راشدین کے ارشادات عمل کی جتنی کچھ الٹی تاویلیں کی ہیں اور ائمہ و فقہاء کی جس طرح غلط ترجمانی کی ہے وہ بجائے خود تحریف دین کی ایک بدترین مثال ہے۔ اور اس کے بعد بھی انہیں اپنے موقف کی صحت پر اصرار ہے تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں:

سے خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

۲۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اگر کوئی شخص شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر مرتد ہو جائے تو رحمان صاحب کے نزدیک عقلاً یہ شخص کسی بچے کا فر (جو شروع سے کافر چلا آرہا ہے) سے زیادہ مضر اور برا نہیں لہذا اگر ایسے کافر کا وجود اسلام کو گورا ہے تو مرتد کو بھی برداشت کرنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بچے کا فر کی اسلام دشمن سرگرمیوں کو دیکھ کر عام مسلمان کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ اس کے برعکس مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جانے والے شخص کی خلاف اسلام کارروائیوں سے مسلمانوں کے بد دل ہونے کا امکان ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ کہیں اسلام میں بھی دوسرے ادیان و مذاہب کی طرح کچھ کمزوریاں اور غلطیاں نہ پائی جاتی ہوں جنہیں دیکھ کر یہ شخص اسلام سے منحرف ہو گیا ہے۔ نیز یہ کہ مرتد — جس کے ساتھ پہلے مسلمانوں کے روابط اور تعلقات قائم تھے — کی بے راہ روی کی پُر فریب زندگی اسلامی معاشرے کے دیگر افراد کو بھی اپنے ساتھ پستی و ذلت میں لے جاسکتی ہے۔ ان مفاسد کے موثر سدباب کے لیے اسے قتل کیا جانا ضروری ہے۔

۳۔ اگر کسی شخص کو مجبور کر کے مسلمان بنایا گیا ہو اور بعد میں جبر کے اثرات زائل ہونے پر وہ پھر کفر اختیار کر لے تو اسے بالاتفاق قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اصلاً دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اسی طرح مرتد اگر قتل کے خوف سے توبہ کر لیتا ہے تو اس توبہ کو صحیح معنوں میں توبہ کیوں سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ توبہ بھی تو اصلاً کفر ہی کے مترادف ہے۔

ٹھیک ہے یہ توبہ اگر اصلاً کفر کے مترادف بھی ہو تو اسلامی معاشرے کو اس کے بعد اس شخص سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ پھر اگر وہ بد ملایا محضی طور پر خلاف اسلام یا مفاد امت کے منافی کارروائیوں میں مصروف پایا گیا تو جرم ثابت ہونے پر قانون اسلامی کے مطابق سزا و تعزیر یا حد شرعی کا مستحق ہوگا۔ جبکہ کافر پر یہ قانون اسلامی کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔

۴۔ سوسائٹی کو ارتداد کے اثرات سے تو مرتدین کو سزائے قتل دے کر بچایا گیا۔ مگر منافقین کے نفاق سے مسلم معاشرہ کا تحفظ کیونکر ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں منافقین کے نام سے کوئی طبقہ مشخص اور متعین نہیں ہوتا کہ جس پر واضح طور پر انگلی رکھی جاسکے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلاں اور فلاں شخص منافق ہے۔ اسلام میں دراصل نفاق کی کچھ علامات بیان کی گئی ہیں اور حقیقی علامات نفاق کسی شخص کی عملی زندگی میں پائی جائیں گی اسی درجے کا وہ منافق ٹھہرے گا۔ اس کو بھی نام لے کر یہ کہنے کی اجازت نہیں کہ تم اتنے فی صد منافق ہو۔ مقصود کلام یہ ہے کہ

منافقین بھی مسلم معاشرہ ہی کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور اس کے تمام فرائض و حقوق کا ان پر بھی یکساں طور پر اطلاق ہوتا ہے۔ ان کے شرور سے بچنے کی صورت بھی وہی ہے جس کا ذکر اوپر تیسرے سوال کے جواب میں کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں مسلم معاشرہ کوئی اندھا بہر معاشرہ نہیں ہوتا نہ یہ سادہ لوح اور بے وقوف قسم کے لوگوں کے مجموعہ کا نام ہے اس معاشرہ میں ایک بڑی تعداد ایسے زیرک اور دانشمند اصحاب کی موجود ہوتی ہے جن کی نظر سے نفاق و ارتداد کے جرائم زیادہ دیر تک چھپے نہیں رہ سکتے۔ پس جو نہی ان بیماریوں کے اثرات ظاہر ہوں وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اسلام کی محافظ قوتوں کی توجہ ادھر مبذول کرائیں تاکہ ان فتنوں کا بروقت سد باب ہو سکے۔

رحمان صاحب نے ارتداد کی سزائے قتل پر ایک یہ اعتراض بھی وارد کیا ہے کہ دنیا جو دارالامتحان ہے اور جس میں آزمائش کے لیے انسان کو بھیجا جاتا ہے اگر اسی میں جسم ارتداد کی سزا دے ڈالی جائے تو انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ نیز فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ رسول پاک نے تو مدینہ کے غیر مسلم قبائل سے یہ آزادی سلب نہیں کی تھی۔

دنیا میں انسان کے ساتھ آزمائش کی یہ صورت کبھی نہیں رہی کہ انسان کو لامحدود آزادی دے دی گئی ہو۔ لامحدود آزادی نہ ہزاروں سال پہلے کے انسان کو نصیب ہوئی اور نہ آج کے دور تہذیب و تمدن میں ہی اس کا کہیں وجود پایا جاتا ہے۔ اسلام نے انسان کو ارادہ و اختیار کی جو آزادی عطا کی ہے وہ بھی ہر قدم اور زندگی کے ہر موڑ پر اسے میسر نہیں۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد اس کی آزادی کا معتد بہ حصہ اس سے چھین جاتا ہے یا وہ اپنی آزاد مرضی سے اس سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ پس قبول اسلام کے بعد اگر کوئی چاہے کہ دورِ جاہلیت کی سی آزادی سے متمتع ہو تو یہ ناممکن ہے۔ وہ ایک بار رد و قبول اسلام کے وقت اپنے ارادہ و اختیار کو استعمال کر چکا اس کے بعد اس نوعیت کا اختیار اسے دو بارہ نہیں مل سکتا۔ البتہ احکام اسلام پر عمل پیرا ہونے یا نہ ہونے کا اختیار باقی رہ جاتا ہے۔

مدینہ کے غیر مسلم قبائل کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آزادی عطا کی تھی وہ بے قید نہیں تھی بلکہ معاہدات و موثقیق نے اسے بہت کچھ محدود کر دیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے انہوں نے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کی انہیں اس کی سزا دی گئی۔ سوال ۲۷ میں بنو قینقاع کو اور ربیع الاول ۶ میں بنو نضیر کو مدینہ سے نکال باہر کیا گیا اور غزوہ احزاب کے موقع پر جب بنو قریظہ نے علانیہ کفار و مشرکین کا ساتھ دیا اور مسلم خواتین

جس قلعہ میں بھتیس اس پر حملہ کر دیا تو جنگ کے خاتمہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ مسلمان ابھی ہتھیار نہ کھولیں اور بنو قریظہ کی طرف بڑھیں چنانچہ ان کا محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک مہینہ کے محاصرہ کے بعد ان کے مردوں کو قتل کر دیا گیا۔ عورتیں اور بچے قید کر لیے گئے اور ان کا مال و اسباب، مالِ غنیمت قرار دے دیا گیا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آج کے دور میں ایک ہی نظریہ کے حامل لوگوں پر مشتمل کوئی ریاست وجود میں نہیں آسکتی تو سوال یہ ہے کہ اس سے کس کو انکار ہے، مگر کیا مختلف نظریات کے حامل گروہوں کو کارفرمائی کی وہی حیثیت دینا بھی ضروری ہے جو ایک مخصوص اور ہمہ گیر نظریہ زندگی پر ایمان رکھنے والے برسرِ اقتدار گروہ کو حاصل ہو۔ ایسا کرنا کوئی ضروری بھی نہیں اور آج تک کسی نظریہ کے حامل یا اختیار طبقہ نے عملاً ایسا کیا بھی نہیں۔ ماضی قریب میں یورپ کے کلیسائی نظام کو دیکھ لیں یا دورِ جدید میں اشتراکی نظریات کے علمبردار ممالک کو۔ رحمان صاحب نے ایک مغالطہ یہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ارتداد کا معاملہ خدا اور بندے کے درمیان ہے اس لیے اس کی سزا کا اختیار بھی صرف خدا کو حاصل ہونا چاہیے۔ دوسری حدود و تعزیرات جن کا نفاذ اسلامی حکومت کرتی ہے وہ اس لیے صحیح ہے کہ ان جرائم میں بندے بندوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ مثلاً قتل کے بدلے میں قتل کرنا۔ زندگی کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ زنا وغیرہ کی سزا عصمت و عفت کے تحفظ کے لیے ضروری ہے اور ہوش و حواس بچانے کے لیے شراب نوشی کی سزا دینا درست ہے مگر ارتداد کی سزا سے رحمان صاحب کے خیال میں صرف خدا کے حق پر ڈاکہ پڑتا ہے۔ معاشرہ کا کچھ نہیں بگڑتا اس لیے خدا کے حق کا تحفظ کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس کے لیے بندے فکر مند ہوں۔ وہ جانے اور اس کا کام۔

اس میں سب سے پہلے تو رحمان صاحب نے یہ بات غلط طور پر فرض کر لی ہے کہ جرائم کی سزائیں انسانوں کو اس لیے دی جاتی ہیں کہ ایک کے ہاتھ سے دوسرے کا حق غصب ہوا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس اصول کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اُس جوڑے کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی جو اپنی مرضی اور مفاہمت سے حرام کاری کا مرتکب ہوا ہو۔ اُس قاتل کو بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا جو اس امر کا ثبوت ہیا کر دے کہ مقتول نے خود اس سے قتل کی درخواست کی تھی۔ اُس بدگوئی اور فحش کلامی پر بھی کوئی تہن نہیں لگائی جاسکتی جسے فریقین بطیب خاطر برداشت کر رہے ہوں۔ پھر یہ بات بھی غلط ہے کہ ارتداد سے صرف خدا کا حق متاثر ہوتا ہے۔ مسلم معاشرہ پر اس کے کوئی اثرات مترتب نہیں ہوتے اس کی وضاحت ہم پہلے کر چکے ہیں علاوہ انہیں

اسلام حکومت اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی نمائندہ ہیئت ہوتی ہے۔ پس اگر خدا اپنے با اختیار نمائندوں سے اپنے حقوق کا تحفظ کرانا چاہے تو رحمان صاحب کو کیا اعتراض ہے؟ من غیر دینہ فاضرہ جو اعتقدہ۔ بحرالمحیط کے حوالہ سے بھی رحمان صاحب نے نہایت غلط طریقے سے اپنے موقف کی تائید چاہی ہے۔ کہتے ہیں کہ علامہ ابو حیان نے آیت لا اکرہ فی الدین کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرتد کو دوبارہ اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس طرح دنیا کے دارالابتلاء (آزمائش کا گھر) ہونے کا تصور باطل ہو جائے گا۔ حالانکہ علامہ موصوف نے آیت مندرجہ بالا کی تفسیر کرتے ہوئے مختلف آثار و اقوال نقل کیے ہیں۔ ان میں سے ایک قول بصیغہ تریض یہ بیان کیا ہے:

وقیل لا یکرہ علی الاسلام من
خروج الی غیرہ۔
اور کہا گیا کہ جو شخص دائرہ دین سے نکل کر کسی
دوسرے مذہب کی طرف چلا گیا اسے دین
اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد انہوں نے ابو مسلم اور لفظال کا ایک اور قول نقل کیا ہے جو یہ ہے:

معناہ انہ ما بنی تعالیٰ امر الایمان
علی الاجبار والقسر و اغمابناہ
علی التمكن والاختیار و یدل
علی هذا المعنی انہ لما بین دلائل
التوحید بیا نا ثنا فیما قال بعد ذلك
لو یتقی عذرا فی الکفر الان یقتسر
علی الایمان و یجبر علیہ و هذا ما
لا یجوز فی دار الدنیا التي هی دار
الابتلاء اذ فی القهر والاکراہ علی
الدین بطلان معنی الابتلاء۔

(بحرالمحیط جلد ۲ صفحہ ۲۸۲)

اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی بنیاد
جبر و اکراہ پر نہیں رکھی بلکہ تمکن و اختیار پر اس
کی بنیاد رکھی ہے۔ اور اس معنی پر یہ آیت اس
لیے دلالت کرتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے
توحید کے دلائل واضح طور پر بیان کر دیئے
(معلوم رہے کہ آیت لا اکرہ فی الدین آیت الکرسی
کے متصلاً بعد آتی ہے) تو اس کے بعد فرمایا
کہ اب کسی کے لیے کفر پر قائم رہنے کا کوئی
غدر باقی نہیں رہا (لہذا انہیں سیدھی طرح اسلام
قبول کر لینا چاہیے) یا پھر انہیں ایمان لانے
پر مجبور کیا جائے۔ مگر یہ دار دنیا میں جائز
نہیں جو کہ فی الاصل آزمائش کی جگہ ہے کیونکہ

اگر قبولِ دین پر لوگوں کو مجبور کیا جائے تو اس سے آزمائش کا مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا۔

اس مؤرخ اندک قول کا پہلے قول سے کوئی تعلق نہیں مگر رحمان صاحب نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے پہلے قول کو دوسرے کے ساتھ ملا کر اس تشریح کا تعلق ارتداد کے ساتھ جوڑ دیا جسے علمی خیانت کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

وہ گئے شیخ محمد شلتوت تو انہوں نے اگر کہا بھی ہو کہ عملاً مخالفت و بغاوت ہی کے نتیجے میں کسی کو قتل کیا جاسکتا ہے تو وہ ہمارے لیے حجت نہیں بن سکتے۔ اسلامی عقائد و تعلیمات کا اثبات و تحقیق اس سے بہت بلند ہے کہ پوری امتِ مسلمہ کے اتفاق و توثیق کو نظر انداز کر کے دورِ حاضر کے چند دانشوروں کی بات مان لی جائے۔

ہم نے سطورِ بالا میں رحمان صاحب کے ان اعتراضات اور مخالفتوں کا جائزہ لیا ہے جنہیں موصوف نے اپنی کتاب کے آخر میں قاری کے ذہن میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ارتداد کے مسئلہ پر وہ اگر فاضل مصنف کے موقف سے متفق نہ بھی ہو تو کم از کم شبہ میں ہی پڑ جائے اور مستقل طور پر ایک خلش میں مبتلا رہے حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر رحمان صاحب کے نہ یہ اعتراضات نئے ہیں اور نہ وہ دلائل ہی جو انہوں نے سزائے ارتداد کا انکار کرتے ہوئے دیئے ہیں۔ ان کا کام صرف اتنا ہے کہ دینِ دشمنی، اباحت پسند اور مغربی تعلیمات سے متاثر لوگوں نے وقتاً فوقتاً ارتداد کی سزا کے متعلق جو کچھ کہا ہے اُسے منظم اور مرتب صورت میں بیان کر دیا ہے تاہم وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

انہوں نے آیاتِ قرآن، احادیثِ رسول، نظائرِ خلافتِ راشدہ اور اقوالِ فقہاء سے اپنے موقف کی تائید میں استدلال کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس مقالہ میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اکثر و بیشتر ان کا استدلال غلط ہے۔ اس مقالہ میں ان کی تقریباً ہر اُس بات کا تعاقب کیا گیا ہے جس میں قاری بظاہر کچھ وزن محسوس کر سکتا ہے یا جسے پڑھ کر شکوک و شبہات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ البتہ نہایت کمزور اور بالواسطہ قسم کے ماخذ سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ آخر ارتداد جیسے خالص علمی موضوع کا ان حوالہ جات سے کیا تعلق ہے جو اخبارات کے گننام اہل قلم کا نتیجہٴ فکر ہوں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دینِ اسلام کے ایک متفق علیہ مسئلہ کا انکار موصوف کے سر پر کچھ اس طرح سوار رہا ہے کہ اس راہ میں کوئی

مقدس سے مقدس صحیفہ و فرمان بھی ان کے رہو اور قلم کو روک نہیں سکا۔ انہوں نے متعدد مقامات پر بڑی ناروا جساتیں کی ہیں جن کا اندازہ اہل علم فریقین کے دلائل دیکھ کر کر سکتے ہیں۔

ہماری رائے میں رحمان صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ان لوگوں کو تقویت پہنچائی ہے جو مسلمان کہلا کر عملاً اسلام سے ارتداد و انحراف کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور اسلامی عقائد و تعلیمات سے انکار کے باوجود مسلم معاشرے سے اپنے آپ کو چپکائے رکھنے پر مصر ہیں۔



تَصْحِيْحًا

۱- تفہیم القرآن، جلد ششم، صفحہ ۲۴۱ سطر ۲۱ میں آیت کا حوالہ القصص، آیت ۴۴ غلط درج ہو گیا ہے۔ صحیح حوالہ طہ، آیت ۴۴ ہے۔

۲- ترجمان القرآن، اگست ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۵۷، سطر ۲ تا ۴ میں ایک تاریخی بیان غلط درج ہو گیا ہے۔ میں نے غلطی سے یہ لکھ دیا ہے کہ بنی عبدمناف میں سے شیبہ فتح مکہ کے وقت تک کلید بردار کعبہ تھا... جتنی کہ آج تک کلید برداری کعبہ اسی کے خاندان میں چلی آ رہی ہے۔ یہ پوری عبارت قلمزدکری جانے کیونکہ یہ تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔ کلید برداری کعبہ کا منصب بنی عبدمناف کے پاس نہیں بلکہ بنی عبدالداری کے پاس تھا۔ اور فتح مکہ کے وقت حضور نے اسی خاندان میں یہ منصب برقرار رکھا اور آج تک اسی کے پاس کلید کعبہ ہے۔